۷۸۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

علامہ اقبال

یعنے

علامہ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی
کے متعلق چند عقیدت مندانہ خیالات

از

مولوی سید محمد عبد الرشید منشی فاضل و ادیب فاضل
ہیڈ مولوی مہاراجہ کالیجیٹ ہائی سکول جے پور

باہتمام کمترین الیس یاض الدین عفی عنہ

الیکٹرک ابو العلائی پریس آگرہ میں چھپا

۴۸۶

جملہ حقوق محفوظ ہیں

علامۂ اقبال

یعنی

علامہ مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے

متعلق چند عقیدت مندانہ خیالات

از

(مولوی) سید محمد عبدالرشید منشی فاضل و ادیب فاضل

ہیڈ مولوی مہاراجہ کالجیٹ ہائی سکول جیپور

باہتمام ایس۔ ریاض الدین عفی عنہ

الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ میں چھپا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ایک وقت وہ تھا جبکہ مسلمانوں کے اقبال و کامرانی کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ہر فن کے صاحب کمال اسلام کے جھنڈے تلے جمع تھے۔ شیراز کی سرزمین نے سعدیؒ و حافظؒ جیسی ہستیاں پیدا کر کے اپنا سر آسمان پر پہنچایا۔ گنجہ میں نظامیؒ اور جام میں جامیؒ نے دیدبۂ خسروی بلند کر کے اپنے خداوند سخن ہونے کو منوایا۔ طوس کی قسمت جاگی کہ اسمیں فردوسی پیدا ہوا اور ہندوستان کے بھاگ کھلے کہ اسمیں خسروؒ اور فیضی جیسی ہستیوں نے جنم لیا۔ لیکن زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے آخر وہ بساط الٹ دی اور اس پیمان شکن آسمان نے پیمانہ توڑ دیا۔ وہ عہد گل ختم ہوا ٹوٹ گیا ساز چمن۔ اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پرداز چمن۔ لیکن ہندوستان کو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئیے کہ وہ ایران سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوا۔ اسلئے کہ یہاں پھر ایک آواز سنائی دیتی ہے وہی آواز جو کسی وقت اسکے در و دیوار سے ٹکرا کر آسمان تک ہو نکلتی تھی آج ایک اور ہی لب ولہجہ اختیار کر کے افسردہ دلوں میں شگفتگی اور مردہ دلوں کو زندگی کے سامان بہم پہنچا رہی ہے۔ اقبال ہمارے اسلاف کی نشانی ہماری عظمت پارینہ کی یادگار۔ نہیں نہیں ہماری گذشتہ اقبال مندی و خوش نصیبی کا آئینہ۔ ایسا آئینہ جس میں وہ شکلیں نظر آتی ہیں جن پر کبھی اسلام کو ناز تھا۔

آج مسلمانوں کی شان و شوکت کی یادگار کا ستارہ بنکر افق مشرق پر چمک رہا ہے۔

شیخ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے انکی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہیں لینے دیا اور مجبور کیا کہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

ممکن ہے شیخ صاحب کا خیال بجائے خود صحیح ہو مگر میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ یہی شاعری جس نے چھٹی صدی ہجری میں مطلق العنان اور سرکش بادشاہوں کی نمرودیت کو مٹا کے انکے سر کو خدائے واحد کی چوکھٹ پر جھکانے اور عامۃ الناس کی بہبودی کی اصلاح کرنے کا مشن اپنے ذمے لیا تھا آج مسلمانوں کی حالت پر رحم کرکے خدا تعالیٰ نے اقبال کو ودیعت فرمائی ہے کہ اس کے ذریعے اس خفتہ قوم کو بیدار کرے۔ بانگ درا ابتک بانگ درا ہی اگر قافلہ والوں میں کچھ بھی زندگی کے آثار موجود ہیں تو اس آواز کے سہارے منزل پر پہنچنا ممکن ہے۔ اقبال نے ایک جگہ شاعر کو مخاطب کرکے کہا ہے ؎

ہے اگر ہاتھوں میں تیری خامۂ معجز رقم — شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثال جام جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو — ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
مرنے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے — خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

ایسا ہی ایک جگہ پیام مشرق میں کہا ہے ؎

زمن اے شاعر رنگیں بیاں گو — چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی
نہ خود را می گداز از آتش خویش — نہ شام دردمندے بر فروزی

مگر اقبال کا زیادہ تر کلام فارسی میں اور وہ بھی فلسفیانہ رنگ میں ہے اس لئے اکثر و بیشتر لوگ اس حقیقت سے بےخبر ہیں اور صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایک شاعر ہے اور نیچرل شاعری کا علمبردار لیکن جو کچھ اقبال ہے وہ بہت کم جانتے ہیں جیسا کہ خیام کی نسبت اہل مشرق کو یہی معلوم تھا کہ وہ ایک شاعر ہے اور رباعی کا استاد۔ مگر جب اہل یورپ کی عقابی نظر نے اس کی وہ تصانیف دریافت کرلیں جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چودہ علوم کا ماہر و باکمال استاد تھا اور رباعیاں محض تفریح طبع یا اظہار جذبات کے لئے کہہ لیا کرتا تھا۔ تو مشرق والوں کی آنکھیں کھل گئیں اور چار و ناچار ماننا پڑا کہ درحقیقت خیام بڑی شخصیت کا آدمی تھا۔

یہی معاملہ آج اقبال کیساتھ ہے۔ دوسروں کی شکایت نہیں جب کہ خود مسلمان
جن کا ندروہ ازل سے اپنے ساتھ لایا ہے اس کو محض ایک شاعر سمجھتے ہیں بلکہ سچ پوچھے
تو اس اعتبار سے بھی جیسا کہ اس کو سمجھنا چاہئے تھا نہیں سمجھا گیا شاید ٹیگور کی
شہرت اقبال سے کہیں زیادہ ہے حالانکہ علمی حیثیت سے چہ نسبت خاک را با عالم پاک
ٹیگور کی نگہ دوراندیش ایک خاص موضوع تک محدود ہے۔ یعنی اس نے قدرت کے وہ
دلفریب مناظر جنمیں سکون و خاموشی کی شان پائی جاتی ہے نہایت دلکش پیرایہ میں دکھائے
ہیں اور بس۔ چونکہ یورپ ایک عرصہ ہوا اس نعمت کو اپنی پرہیجان زندگی کے نذر
کرچکا تھا اس لئے اس نے تسلیم کیا کہ یہ وہی چیز ہے جو کبھی ہماری زندگی کا سامان
تھی اور ٹیگور ہماری اسی حالت کا ترجمان ہے۔ اور اس شہرت کے اسباب اس کی
قوم نے پیدا کیے۔ مگر اقبال نے وہ اصول یاد دلائے ہیں جن پر ہمارے عروج و ارتقا
کی بنیادیں قائم کی گئی تھیں اور جواب بھی معراج کمال پر پہنچا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان پر
عمل پیرا ہوں لیکن ہمنے اسکے لئے کچھ نہیں کیا۔ اس کا بجز اس کے اور کیا سبب ہو سکتا ہے
کہ قوم میں سے مردم شناسی کا مادہ اٹھ گیا اور قابلیت و استعداد دیوالیہ ہو چکی جیسا کہ
خود اقبال محسوس کرتا ہے۔

عصر من داننده اسرار نیست — یوسف من بہر ایں بازار نیست
قلزم یاراں چو شبنم بے خروش — شبنم من مثل طوفاں یم بدوش
نغمۂ من از جہان دیگر است — ایں جرس را کاروان دیگر است

اقبال کی ایک نظم "شمع و شاعر" ہے جسمیں مکالمہ کے طور پر اول شاعر نے شمع سے
کچھ سوالات کیے ہیں۔ اس کے بعد شمع نے جواب دیا ہے کہ۔

تھا جنہیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہو گئے — لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے — ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو گئی | پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخری شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ | صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
پھول بے پروا ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو | کارواں بے حس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

غرضکہ اقبال نے شمع کی زبانی فضل و ہنر کی کساد بازاری کا شکوہ نہایت پُر اثر الفاظ میں کیا ہے کون ہے جو فیضی کی جامعیت و ہمہ گیری کا معترف نہیں مگر غالباً اسکو بھی اہل مشرق کی ذہنیت کا اندازہ ہو گیا تھا اسلئے اس نے اس خوف سے کہ مبادا مجھے بھی لوگ شاعر محض سمجھ کر اس مرتبہ سے گرادیں جس کا میں از روئے کمالات مستحق ہوں نل دمن میں ایک جگہ نہایت پُرزور الفاظ میں کہا ہے

امروز نہ شاعرم حکیمم | دانندۂ حادث و قدیمم

اسکے یہ معنی ہیں کہ ایک حکیم اپنی طبیعت کی لطافت و ہمہ گیری کے سبب سے مسائل حکمت کو شاعری کے رنگ میں بیان کرسکتا ہے کہ اس سے وہ مسائل آسان بھی ہو جاتے ہیں اور دلنشین بھی مگر ایک شاعر جو فلسفہ و حکمت سے قطعاً معرا ہے حکیم نہیں ہو سکتا خواہ کتنا ہی اعلیٰ پایہ کا شاعر کیوں نہ ہو حکیم وہ ہے جو نفس انسانی کو کمال تک پہنچانے کیلئے احوال موجودات کو بقدر طاقت بشری کما ینبغی جانے اور اسپر عمل کرے۔ اقبال نے بھی ایک جگہ اسرار خودی میں کہا ہے

کم نظر بیتابی جانم ندید | آشکارم دید و پنہانم ندید
آشنائے من ز من بیگانہ رفت | از خمستانم تہی پیمانہ رفت
از حدیث دلبری خواہد ز من | رنگ و آب شاعری خواہد ز من
من شکوہ خسروی او را دہم | تخت کسریٰ زیر پائے او نہم

؎

چشمۂ حیواں براتم کردہ اند | محرم راز حیاتم کردہ اند
ہیچکس رازیکہ من گویم نگفت | ہمچو فکر من دُرِ معنی نسفت

سر عیش جاوداں خواہی بیا ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

دیکھیے۔ گلستاں اور بوستاں کی تعلیم اولاً مکتب پر شروع ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ جہاں تک لوگ سمجھتے گئے اور ان کتابوں کی حقیقت معلوم ہوتی گئی انکی قبولیت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ یہی کتابیں آئین سلطنت میں داخل ہو گئیں اور بادشاہوں نے ان کو اپنا دستور العمل بنا لیا۔ اور اسوقت جتنی مشہور زبانیں دنیا میں بولی جاتی ہیں کم و بیش اُن سب میں انکا ترجمہ ہو چکا ہے یہی مثنوی معنوی کا حال ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے منطق الطیر میں لکھا ہے کہ "مولانائے روم نے تو زبان شعر کو الہامی بنا دیا" مرزا احسان احمد لکھتے ہیں کہ "مثنوی مولوی روم بظاہر چند فرضی افسانوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے چنانچہ عام طور پر واعظین اور علما محض گرمی محفل کے لئے اسکے اشعار پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ کسکو معلوم تھا کہ انہیں افسانوں میں علم کلام کے اسرار و معارف بھی پنہاں ہیں یہ علامہ شبلی کا فلسفیانہ دماغ تھا جس نے انہیں حکایتوں سے ایک مستقل علم کلام مرتب کیا" بلکہ مثنوی کے لئے تو یہاں تک کہدیا کہ

مثنوی مولوی معنوی + ہست قرآں در زبان پہلوی

میرا منشا یہ ہے کہ آیا ان مقدس ہستیوں کے لئے ایک شاعر کا لفظ موجب فخر ہو سکتا ہے؟ اور کیا بوستان اور مثنوی معنوی کیلئے شاعری کے چٹخارے لینے کیلئے لکھی گئیں تھیں۔ ہرگز نہیں ان بزرگوں کا کام شاعری نہ تھا جیسا کہ خود مولانائے روم فرماتے ہیں۔ من ندانم فاعلاتن فاعلات ایک گویم شعر چوں آب حیات = بلکہ ان کا کام بنی نوع انسان کی اصلاح اور خدا کا راستہ بتانا تھا جسکو قوت سے فعل میں لانیکے لئے شعر کی قوت تاثیر کو بہتر و کار آمد سمجھا اسلئے ان لوگوں کو ایک شاعر کی حیثیت سے ماننا اور اس اصل مقصد و غایت کو نظر انداز کر دینا جو اس شاعری کے اندر پوشیدہ ہے اس بات کی نمائش ہے کہ ہم حقیقت اور مجاز میں تمیز کرنیکی قابلیت و استعداد نہیں رکھتے۔ اسیطرح اقبال کو بھی نرا شاعر سمجھ لینا اپنی انتہائی کم نظری کا اظہار کرنا ہے۔

میں اقبال کے کلام میں سے چند ایک مثالیں دیکر اس بات کو واضح کرنیکی کوشش کرونگا کہ اقبال کی جو جدو

زمانہ میں نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ تمام ایشیا کو کسقدر ضرورت ہے۔

(۱) اقبال کے کلام کا معتدبہ حصہ وہ ہے جس میں اُس نے جدوجہد و کوشش کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ مصیبت اور تکلیف محض اعتبارات ہیں بلکہ اگر غور سے دیکھئے تو یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کی تکمیل و بقائے دوام کا باعث ہوتی ہیں۔

مبارزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز — حیات جاودان اندر ستیز است

اقبال نے اسی خیال کو زیادہ واضح اور موثر بنانے کے لئے دو ہرنوں کا مکالمہ نظم کیا ہے جو لطف سے خالی نہیں۔

پہلا ہرن۔ اے یار غمگسار! میں ان شکاریوں سے عاجز آگیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ حرم میں جا کر رہوں اسلئے کہ خبر نہیں ہر لحظہ شکاری کا اندیشہ رہتا ہے جس سے ہماری زندگی نہایت بے لطفی سے بسر ہوتی ہے۔

دوسرا ہرن۔ اے یار خردمند! یہ سب کچھ سہی لیکن اگر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہو تو خوف و خطر میں زندگی بسر کرو۔ اور تلوار کی طرح جو سان پر گھسنے سے زیادہ تیز ہوتی ہے مصیبت اور تکلیف میں رہکر اپنے آپ کو پختہ اور کامل بناؤ۔ اسلئے کہ مصائب و آلام ایک قسم کا امتحان ہیں اور خوف و خطر میں مردوں کے جوہر کھلتے ہیں۔

غزالے با غزالے درد دل گفت — ازیں پس در حرم گیرم کنامے
بصحرا صید بندان در کمین اند — بکام آہوان صبحے نہ شامے
امان از فتنۂ صیاد خواہم — دلے ز اندیشہ آزاد خواہم
رفیقش گفت اے یار خردمند — اگر خواہی حیات اندر خطر زی
دمادم خویشتن را بر فسان زن — ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی
خطر تاب و توان را امتحان است — عیار ممکنات جسم و جان است

منشا یہ ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی جو فی الحقیقت قوائے عمل کو بیکار و مفلوج بنا دیتی

ہے دنیا بھر کی نحوست و بدبختی کا پیش خیمہ بلکہ موت کا پیغام ہے۔ اگر انسان کو حیات ابدی کی تلاش ہے اور نام و نمود کی تمنا تو اپنے آپ کو محنت و ریاضت کے نذر کر دینا چاہیئے اور مصائب و آلام کا جو ترقی کی راہ میں حائل ہوں سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنا چاہیئے اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اسکو کوئی حق نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا شکوہ زبان پر لائے اور فطرت کو جو ہر گناہ سے پاک ہے خطا دار ٹھہرائے۔

ایک جگہ زندگی کی تعریف اسطرح کی ہے

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست   گفتا مئے کہ تلخ تر او نکو تر است

یعنی میں نے ایک کامل سے پوچھا کہ زندگی کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک شراب ہے ایسی شراب کہ جس قدر تلخ ہوتی ہے اسی قدر زیادہ اچھی ہوتی ہے۔

ایک جگہ یہ بتایا ہے کہ خوش و اندیشہ سے ہر آسان کام مشکل اور ہمت و استقلال کے آگے مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔

دل بیباک را ضرغام رنگ است   دل ترسندہ را آہو پلنگ است

اگر بیمے نداری بحر صحرا است   اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

ایک جگہ کہا ہے کہ پروانہ اپنے تئیں ایک دفعہ شمع پر نثار کر کے زندگی کی کشاکش سے نجات حاصل کر لیتا ہے مگر میرے نزدیک یہ ہیچ ہے۔ میں تو اس پروانہ کو پروانہ جانتا ہوں جسکی جان سخت کوش اور شعلہ نوش ہے یعنی زندہ رہے اور تکالیف کو برداشت کرے۔

بہل افسانۂ آں پا چراغے   حدیث سوز او آزار گوش است

من آں پروانہ را پروانہ دانم   کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

(۲) اقبال کے نزدیک سکون کا نام موت ہے یعنی انسان کو ایک حالت پر نہیں رہنا چاہیئے بلکہ کوشش و کاوش سے اپنا آج کل سے اور کل آج سے بہتر بنانا چاہیئے اس لئے کہ اس چمن زار کائنات میں امکانِ مستقبل موجود ہے۔

وادم نقشہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است — بخاک تو شرار زندگی نیست

ایک جگہ پیام مشرق میں کہا ہے کہ جسطرح موج جب تک قائم ہے پیچ و تاب میں ہے اور جب پیچ و تاب نہیں تو موج بھی نہیں معلوم ہوا کہ پیچ و تاب اور بیقراری ہی کا نام موج ہے اسی طرح انسانی حیات اسکی تگ و تاز اور سکون نا آشنا رہنے میں ہے نہ کہ راحت طلبی اور تن آسانی میں۔

چہ پرسی از کجائیم چیستیم من — بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
درین دریا چو موج بے قرارم — اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

ایک جگہ کہا ہے کہ زندگی اور اس کا لطف حرکت میں ہے اور چونکہ میں اس راز سے واقف ہوں اسلئے مجھے سفر میں وہ مزا آتا ہے کہ منزل بھی سنگ راہ کی طرح ناگوار معلوم ہوتی ہے اور چلتا ہی رہتا ہوں

مگو از مدعائے زندگانی — ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوق سفر آنگونہ مستم — کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

ایک جگہ دو شعروں میں اس خیال کو کسقدر بلیغ پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ساحل نے جو بالکل جامد اور ساکن ہوتا ہے موج سے کہا کہ اگرچہ میں نے ایک دراز عمر پائی ہے لیکن یہ اب تک معلوم نہ کر سکا کہ میں کیا ہوں موج نے جو ساکن رہنا ہی نہیں جانتی نہایت تیزی سے چل کر کہا کہ اے ساحل! میری حقیقت تو مجھے معلوم ہو گئی اور وہ یہ ہے کہ اگر میں حرکت میں ہوں تو زندہ ہوں ورنہ کچھ بھی نہیں۔

(۴) اقبال عمل و جہد کیساتھ علم کا ہونا لازم سمجھتا ہے۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست — جز بعلم انفس و آفاق نیست
گفت حکمت را خدا خیر کثیر — ہر کجا این خیر را بینی بگیر

یعنی زندگی کسی قوم کا حصہ نہیں بلکہ جو قومیں زیور علم سے آراستہ اور محنت کی خوگر ہیں انہیں کو دنیا میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ علم کی اہمیت کو واضح کرنیکے لئے ایک نہایت عمدہ دلیل پیش کی ہے۔ کہ

سید کل صاحب ام الکتاب — پردگیہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عین ذات را بے پردہ دید — رب زدنی از زبان او چکید

دُنیا کی تمام ترقی یافتہ قومیں اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم کے اندر ہی دینی و دنیوی ترقی کا راز مضمر ہے جس قوم میں جہالت کے آثار پیدا ہوئے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قوم صفحہ ہستی پر چند دنوں کی مہمان ہے زمانہ بہت جلد نقش باطل کی طرح اسکو مٹا کر خدا کی زمین کو اسکے وجود سے پاک کر دیگا۔ امریکہ اور یورپ پر اس حقیقت کا اچھی طرح انکشاف ہو گیا ہے یہی سبب ہے کہ ان ممالک میں تعلیم کی وہ گرم بازاری ہے کہ آج یہاں بے علم ایسا ہی کمیاب ہے جیسا ہندوستان میں تعلیم یافتہ۔ اسلام نے تیرہ سو برس پہلے ہی تعلیم دی تھی اور حصول علم کو ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض کر دیا تھا اور یہاں تک زور دیا کہ۔

حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو — جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

اقبال کہتا ہے کہ۔ علم و دولت نظم کار ملت است + علم و دولت اعتبار ملت است

مگر موجودہ زمانہ میں جہاں تعلیم کا دور دورہ ہے وہاں اخلاق اور سچی اخلاقی تعلیم کا جیسے خاتمہ ہے حالانکہ اخلاق اور وہ اخلاقی تعلیم جسکی بنیادیں خلوص سچائی اور ایثار پر قائم کی گئی ہوں نظام عالم اور اصلاح کار کیلئے ناگزیر ہے۔ اقبال کا دل اس تعلیمی کمزوری اور خرابی کو کیونکر محسوس نہ کرتا اس نے محسوس کیا اور بہت زیادہ محسوس کیا۔ وہ تعلیم کو بُرا نہیں کہتا مگر اسکے نزدیک قدیم اسلامی تعلیم سے بیزاری اور موجودہ تعلیم میں شغف ایسی حالت میں کہ اس سے اخلاق کی اصلاح نہ ہو اضاعت اوقات و گمراہی کا موجب ہے۔

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا — ہے خون فاسد کیلئے تعلیم مثل نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے — واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر
لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری — رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

اقبال نے مذہب کے عنوان سے مرزا بیدل کے شعر پر تضمین کی ہے جسکا مفہوم یہ ہے کہ

فلسفۂ مغرب کی تعلیم ہے کہ جو لوگ ہستی غائب (خدا) کی تلاش میں ہیں وہ نادان ہیں۔ اور اس فلسفہ کی رو سے شیخ اور برہمن دونوں صنم تراش ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ برہمن کا پیکر محسوس و ظاہر ہے اور شیخ کا فرضی اور غائب۔ اقبال کہتا ہے کہ ان علوم جدیدہ سے جنکی بنا محسوس و مرئی اشیاء پر ہے عقائد مذہبی کا شیشہ پاش پاش ہو جائیگا۔ اس تعلیم کی رو سے مذہب جنون میں کوئی فرق نہیں مگر فلسفۂ حیات اور ہی کچھ کہتا ہے۔ اور مجھ پر ایک مرشد کامل نے اس راز کو اس طرح فاش کیا کہ

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش
تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ ناداں ہیں جنکو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

اقبال نے ایک نظم "فردوس میں ایک مکالمہ" کے عنوان سے لکھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایکدن ہاتف غیبی نے مجھ سے کہا کہ جب حالی مرحوم فردوس میں پہنچے تو سعدی علیہ الرحمہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا کہ

اے آنکہ ز نور گہر نظم فلک تاب دامن بچراغ مہ و اختر زدۂ باز
کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیاں کر واماندۂ منزل ہے کہ مصروف تگ و تاز
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اسکی رگوں میں تھی جسکی فلک سوز کبھی گرمی آواز

حالی مرحوم پر ان باتوں کا بہت زیادہ اثر ہوا اور رو کر عرض کرنے لگے کہ اے صاحب اعجاز [illegible]

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے قائم دین زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز

دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

باقی نہ رہا زمزمۂ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

پھر عرض کیا کہ یا حضرت میرے دل نے مجبور کیا اسلئے میں نے آپ سے عرض کر دیا ہے مگر آپ کہیں شاہ یثرب کے حضور میں اسکا ذکر نہ کر دینا ورنہ ہند کے مسلمان مجھے غماز کہیں گے۔ اسپر جواب ملا۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

اسی طرح ملا عرشی کے شعر پر تضمین کی ہے اور موجودہ تعلیم کے نتائج کو بیان کیا ہے۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لیکے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

(۴) اسکے بعد اقبال کی نمایاں خصوصیت اسکی وسیع المشربی ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا پیغام عالمگیر اشاعت حاصل کر کے تمام اقوام کو ایک برادری بنادے اور اسطرح ایک اور ہی دنیا قائم ہو جائے جسمیں صرف محبت و مساوات کی حکومت ہو۔ اقبال کہ توحید کا فرزند اور اس مذہب کا حلقہ بگوش ہے جسکی تعلیم ہے الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ۔ لیکن

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

وہی دوست ہے خالق دوسرا کا
خلائق سے ہے جسکو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

پھر وہ امتیاز ملت و قوم تعصب اور فرقہ بندی کو کیونکر گوارا کرتا۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے

ہم صبا ٹھہرا ہے میری ملت آئین توحید کو
مٹے اہل وطن کے دلمیں کچھ فکر وطن بھی ہو

بستۂ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوع انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں

نیا شوالہ۔ اقبال کی ایک پرانی اور مشہور نظم ہے۔ اسمیں اسی وحدت و اتفاق کے خیال کو برہمن سے مخاطب ہو کر کسقدر خوبصورت اور دلاویز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

آ مل کے غیریت کے پردونکو پھر اٹھا دیں | بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی | آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے | سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے | دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال نے تیمور کی لوح تربت کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جسمیں مرحوم کی زبانی شاعر سے کہا ہے

واں گیا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں | چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے | دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

بلکہ اقبال بنی نوع انسان سے ہمدردی کرتے کرتے بیجان چیزوں سے بھی ہمدردی کرنے لگتا ہے۔ اسلئے کہ اسکے نزدیک حقیقتاً ایک ہی ہے ہر شے کی نوری ہو کہ ناری ہو

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

و دکھتا ہے۔ حد یہ ٹھیس آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر | اشک بنکر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

ایک جگہ پیام مشرق میں کیا خوب کہا ہے۔

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی | تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بویم | ازاں پس ہندی و تورانیم من

(۵) اقبال نے اعتماد نفس پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان کی کمزوری اسکی حقیقت ناشناسی کا نتیجہ ہے اگر انسان کو اپنے علو مرتبہ و کمال ذاتی کا علم ہوجائے تو پھر کوئی کام اسکے لئے مشکل نہیں

اگر آگاہی از کیف و کم خویش | یمے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے | شب خود را بر افروز از دم خویش

دیگر

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست | نشان بے نشان غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہ زیست | بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

دیگر

جہان رنگ و بو فہمیدنی ہست — دریں وادی بسے گل چیدنی ہست
ولے چشم از دروں خود نہ بندی — کہ در جان تو چیزے دیدنی ہست

(۶) علم نفسیات کا عالم اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ فرد واحد کا وجود ایک اعتباری شے ہے مگر چند افراد ملکر ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو انکی قوت انکا رتکاز اور ان کا اعتبار کسقدر بڑھ جاتا ہے۔ غرضکہ جماعت و قوم کو بڑی طاقت حاصل ہے اور فرد کی جماعت سے علیحدہ کوئی وقعت نہیں اقبال نے ربط ملت کے سلسلہ میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ کسی قوم کا اعتبار قائم نہیں ہو سکتا جبتک کہ اسکے افراد میں وحدت خیال وحدت عقائد اور وحدت مقاصد کے ذریعہ ربط و اتحاد پیدا ہو جائے اور مسلمانوں کا ایک مرکز اور ایک مقصد ہو اور وہ ان کا مذہب ہے۔

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں — جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

تو اے کودک منش خود را ادب کن — مسلمان زادہ ترک نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست — عرب نازد اگر ترک عرب کن
نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی — جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

مگر ہم نے اس دور میں مغربی تعلیم و طرز معاشرت سے متاثر ہو کر مذہب کو خیرباد کہدیا۔ اور یہ سمجھ لیا کہ بس کامیابی و ترقی اسی قوم کا حصہ ہے جسکے پاس ہر قسم کے مادی اسباب موجود ہوں۔ اور جنکی عورتیں بے نقاب ہو کر مردوں کے دوش بدوش کام کریں اور جن کا کوئی مذہب نہیں اور اگر ہے تو پالیٹکس سیاسیات اور ملوکیت مگر اقبال کسقدر دلنشین پیرایہ میں سمجھاتا ہے۔ کہ :-

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

(۷) اقبال مسلمان کو آزاد اور مسلمانی کو حریت سے تعبیر کرتا ہے۔ اسکی تعلیم ہے کہ مسلمان کو خیال قول اور فعل میں غرضکہ ہر طرح اپنے آپکو آزاد سمجھنا چاہیے۔ از ماسوا سے در مسلمان بندہ نیست + پیش فرعونے سرش افگندہ نیست یقین کامل رکھتے ہوئے اس معبود حقیقی کے سوا کسی کو اپنا آقا اور مختار نہیں ماننا چاہیے

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

اقبال کا خیال ہے اور خیال کیا معنی حقیقت ہے کہ مسلمان اگر سچا مسلمان ہے تو کسی حالت میں دوسری دنیوی طاقتوں سے مغلوب نہیں ہو سکتا چنانچہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ اُن مٹھی بھر صحرا نشینوں نے جن کے پاس نہ کوئی ساز و سامان تھا نہ کوئی سلطنت محض اپنے اتحاد اور روحانی قوت سے بڑی بڑی طاقتوں کو سرنگوں کر دیا۔

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا — نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں — کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا

تمدن آفریں خلاق آئین جہانداری — وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

غرضکہ اقبال کے نزدیک مسلمان ایک ایسی ہستی ہے جسکی بلندی مرتبہ و رفعت شان کے آگے آسمانوں کی بلندی بھی پست دکھائی دیتی ہے۔

بڑی ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جسکی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور نظام عالم اور امن عالم اسی کے ہاتھوں میں ہے بلکہ انتہا ہے کہ۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اقبال کا ایک خاص موضوع مسئلہ حیات بعد الممات ہے جسکو اسنے فلسفیانہ دلائل و براہین کے ساتھ نہایت منظم طریق پر بیان کیا ہے اسکے متعلق میں خود اقبال کا خیال نقل کرتا ہوں "مجھے مسئلہ حیات بعد الممات کے ساتھ خاص دلچسپی رہی ہے۔ میں انسان کے شاندار اور درخشاں مستقبل کا پختہ یقین رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنیکی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ یہ عقیدہ میرے خیالات و افکار میں آپ کو عموماً جاری و ساری نظر آئیگا مثلاً

فروغ نوریاں از خاکیاں افزوں شود روزے — زمیں از گردش تقدیر او گردوں شود روزے
خیال ما کہ او را پرورش دادند طوفانہا — ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنی آدم نگر از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

(۹) اقبال کا ایک مستقل موضوع مسئلہ خودی ہے خودی سے اسکا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی حقیقت ایک ہے اور انسان جب اس سے واقف ہو جاتا ہے تو ہر چیز میں اپنی ہی صورت جلوہ گر دیکھتا ہے۔ اقبال نے بتایا ہے کہ نظام عالم کی اصل خودی سے ہے اور حیات تعینات کا تسلسل استحکام خودی پر منحصر ہے۔ لیکن اول اپنی خودی (حقیقت) سے واقف ہونیکی ضرورت ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است — ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او — غیر او پیداست از اثبات او

چونکہ حیات عالم کا انحصار قوت خودی پر رکھا گیا ہے اسلئے جسقدر یہ استوار ہوگی اسی قدر زندگی دیرپا مستحکم اور عزیز تر ہوگی۔

چوں حیات عالم از زور خودی است — پس بقدر استواری زندگی است

قطرہ چوں حرف خودی از بر کند — ہستی بے مایہ را گوہر کند
کوہ چوں از خود رود صحرا شود — شکوہ سنج جوشش دریا شود
سبزہ چوں تاب دمید از خویش یافت — ہمت او سینۂ گلشن شگافت

اور حیات خودی تخلیق و تولید مقاصد سے وابستہ ہے یعنی انسان کے مقاصد بلند اور آرزو مسلسل ہونی چاہیئے۔ اس لیئے کہ اصل زندگی آرزو ہے۔

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار — تا نگردد مشت خاک تو مزار
دل ز سوز آرزو گیرد حیات — غیر حق میرد چو او گیرد حیات
چوں ز تخلیق تمنا باز ماند — شہپرش بشکست و از پرواز ماند

یعنی اگر انسان کے دل میں آرزو باقی ہے تو وہ قوی دل بلند حوصلہ اور خوش و خورم ہے محنت و مشقت میں اس کو مزا آتا ہے لیکن جب آرزو مر جاتی ہے تو دل مُردہ حوصلے پست اور زندگی بے لطف ہو جاتی ہے۔

آرزو صید مقاصد را کمند — دفتر افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفی تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصان سوز افسردہ کرد

لیکن شرط یہ ہے کہ مقصد پاکیزہ اور آرزو ارفع و اعلیٰ ہونی چاہیئے۔

مقصدے مثل سحر تابندۂ — ماسوا را آتش سوزندۂ
مقصدے از آسماں بالاترے — دلربائے دلستانے دلبرے
باطل دیرینہ را غارت گرے — فتنہ در جیبے سراپا محشرے

پھر یہ بتایا ہے کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی ست — زیر خاک ما شرار زندگی ست

از محبت می شود پاینده تر — زنده تر سوزنده تر تابنده تر
از نگاهِ عشق خارا شق شود — عشق حق آخر سراپا حق شود
عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشم نوحے قلب ایوبے طلب

مگر عشق حق بغیر کسی کامل کی خدمت کے حاصل نہیں ہو سکتا - اسلئے پیر کامل و مرد خدا شناس کو تلاش کرنا اور اسکی خدمت کو سرمایہ حیات سمجھنا چاہیئے - اقبال نے مولانا روم کی مثال پیش کی ہے جنہوں نے شمس تبریزؒ کی خدمت سے وہ مرتبہ حاصل کیا جو افہام و تفہیم میں نہیں آسکتا - بتایا ہے کہ مسلمانوں کیلئے عشق رسول کافی ہے اور ان کو اس تمنا سے اپنا دل آباد کرنا چاہیئے - اسلئے کہ اس سے بہتر کوئی مقصد نہیں ہو سکتا

ہستی مسلم تجلی گاہ او — طورہا بالد ز گرد راہ او

اقبال نے اپنا شوق رسول نہایت دلکش پیرایہ میں ظاہر کیا ہے جسمیں کہیں بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں کہیں آئینے جھلملاتے دکھائی دیتے ہیں - غرضکہ تاثرات قلبی کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے روبرو پیش کردی ہے

شور عشقش از نئے خاموش من — می تپد صد نغمہ در آغوش من
من چہ گویم از تولایش کہ چیست — خشک چوبے در فراق او گریست
پیکرم را آفرید آئینہ اش — صبح من از آفتاب سینہ اش
ابر آذار است و من بستان او — تاک من نمناک از باران او

اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ کسی کے آگے دست سوال پھیلانے سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے - انسان کو چاہیئے کہ محض خدا پر بھروسہ رکھے اور کسی کا زیر بار احسان نہو - اقبال نے تمثیلاً ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب بحالت سواری اشتر جناب فاروق اعظم کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا تو اسے زمین پر سے اٹھانے کیلئے آپ خود اونٹ سے اترے اور اس معمولی کام کے لئے بھی کسی کا احسان گوارا نہ فرمایا -

خود فرود آ از شتر مثل عمر — الحذر از منت غیر الحذر
تا بکے دریوزۂ منصب کنی — صورت طفلاں ز نے مرکب کنی
فطرتے کو بر فلک بندد نظر — پست می گردد ز احسان دگر

اقبال کہتا ہے کہ خواہ انسان کیسا ہی پریشان حال اور تنگ روزی ہو جائے لیکن رزق کیلئے دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ورنہ حشر کے دن اپنے پیغمبر کے آگے شرمندہ و خجل ہونا پڑیگا کیونکہ آنحضرت نے فرمایا ہے کہ اپنی روزی اپنے قوت بازو سے حاصل کرو۔ اس لئے کہ خدا کسب کرنے والے کو دوست رکھتا ہے۔

رزق خویش از نعمت دیگر مجو — موج آب از چشمۂ خاور مجو
تا نباشی پیش پیغمبر خجل — روز فردائے کہ باشد جاں گسل
ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز — آبروئے ملت بیضا مریز
آنکہ خاشاک بتاں از کعبہ رفت — مرد کاسب را حبیب اللہ گفت

اور جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظام عالم کے ظاہر و مخفی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے

از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرمان دہ عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود — ماہ از انگشت او شق می شود
در خصومات جہاں گردد حکم — تابع فرمان او دارا و جم

اقبال نے بوعلی شاہ قلندر کا واقعہ نظم کیا ہے کہ ان کا ایک مرید خوش باش بازار میں آیا اتفاق سے اس شہر کے حاکم کی سواری آرہی تھی چوبداروں نے درویش کو راستہ میں دیکھ کر آواز ماری کہ اے دیوانے راستہ میں نہ آ۔ مگر درویش اپنے دریائے فکر میں محو دنیا کے معاملات سے بے خبر شراب عشق بوعلی میں مست چلا جا رہا تھا اس کو بھلا ایسی باتوں کی کب پروا ہونے لگی تھی۔ چوبدار نے جوش غرور و نخوت میں چور ہو رہا تھا۔ اس مرد فقیر کے سر پر ایک چوب دستی رسید کی۔ فقیر آزردہ خاطر ہو کر وہاں سے لوٹ گیا اور

وہاں سے چلدیا اور شیخ کے پاس جاکر فریاد کی۔ اور بے تحاشا رونے لگا۔ شیخ نے جب یہہ ماجرا سنا تو بہت غضبناک ہوئے اور اپنے منشی کو حکم دیا کہ فوراً ایک فرمان بادشاہ کو لکھو کہ میرے غلام کو تیرے عامل نے مارا ہے یا تو اس عامل کو اسی وقت برطرف کردے ورنہ تیرے ملک کو ابھی دوسرے کے حوالہ کرتا ہوں۔ جب وہ فرمان بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ زرد ہوگیا اور مارے خوف کے کانپنے لگا۔

نامۂ آں بندۂ حق دستگاہ — لرزہ ہا انداخت در اندام شاہ
پیکرش سرمایۂ آلام گشت — زرد مثل آفتاب شام گشت

اسی وقت عامل کو قید کیا۔ اور خسرو علیہ الرحمۃ کو شیخ کی خدمت میں سفیر بناکر بھیجا اور معافی چاہی
اقبال کہتا ہے کہ نفی خودی کا مسئلہ اقوام مغلوبہ کی ایجاد ہے اس لئے کہ وہ اس ترکیب سے اقوام غالبہ کے اخلاق کو ضعیف کرنا چاہتی ہیں تمثیلاً ایک نہایت دلچسپ حکایت لکھی ہے جس کا ماحصل یہہ ہے کہ کسی چراگاہ میں کچھ بھیڑیں رہتی تھیں۔ جگہ نہایت سرسبز و شاداب تھی گھاس کی بہتات پانی کی فراوانی تھی۔ اور کسی قسم کا خدشہ نہ تھا بھیڑوں کی زندگی نہایت اطمینان اور فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ مگر آسمان اس عیش کو نہ دیکھ سکا۔ اور تیر بلا کی بارش کرنی شروع کردی۔ یعنی شیروں نے جنگل سے نکلکر بھیڑوں کی چراگاہ پر شبخون مارنا شروع کردیا اور غریب بھیڑوں کے خون سے مرغزار کو لالہ زار بنادیا۔ جب کوئی چارہ کار نہ دیکھا اور بھیڑیں ہر طرح عاجز ہوگئیں تو ان میں سے ایک نے جو کہ چالاک عقیل اور گرگ باراں دیدہ تھی دل میں سوچی کہ زور و قوت سے شیروں کا مقابلہ کرنا تو رعد و برق سے کھیلنا ہے۔ بھلا ہماری نرم و نازک کلائیاں شیر کے بازوئے فولادی کے آگے کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ اور یہہ بھی ناممکن ہے کہ پند و موعظت سے بھیڑ اپنی بزدلی کو ترک کرکے بھیڑیے کی خو اختیار کرلیں مگر ہاں ایک بات ہوسکتی ہے کہ شیر نر کو ترکیب سے بھیڑ بنایا جاسکتا ہے۔ یعنی اس کو اپنی خودی سے غافل کردیا جائے اور یہہ آسان ہے چنانچہ نبی مرسل بنکر شیروں کے جرگہ میں آپہنچی اور ان کو نصیحت کرنے لگی۔

نعرہ زد اے قوم کذابِ اشر ‌‌‌‌‌ بے خبر از یوم نحسِ مستمر

مایہ دار قوتِ روحانیم ‌‌‌‌‌ بہرِ شیران مرسلِ یزدانیم

دیدۂ بے نور را نورِ آدم ‌‌‌‌‌ صاحبِ دستور و مامورم آمدم

توبہ از اعمالِ نامحمود کن ‌‌‌‌‌ اے زیان اندیش فکرِ سود کن

ہر کہ باشد تند و زور آور قوی ست ‌‌‌‌‌ زندگی مستحکم از نفیِ خودی ست

روحِ نیکاں از علف یابد غذا ‌‌‌‌‌ تارک اللحم ست مقبولِ خدا

تیزیِ دنداں ترا رسوا کند ‌‌‌‌‌ دیدۂ ادراک را اعمیٰ کند

جستجوئے عظمت و سطوت شر است ‌‌‌‌‌ تنگدستی از امارت خوشتر است

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند ‌‌‌‌‌ تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

ایں علف زارِ جہاں ہیچ است ہیچ ‌‌‌‌‌ تو بریں موہوم اے ناداں مپیچ

غرضیکہ جس طرح ہمارے آجکل کے صوفی خیال کے واعظ دُنیا کی بے ثباتی بیان کرتے ہوئے جاہ و منصب سے نفرت پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور بجائے علمی جدوجہد ترقی اور حصولِ معالی کی رغبت دلانے کے ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتے ہیں۔ اسی طرح اُس بھیڑ نے بھی اپنی دلفریب و ہوشربا تقریر سے شیروں پر ڈورے ڈالنے اور ان کا اپنے جال میں پھنسانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ شیر تو پہلے ہی سے محنت و مشقت سے اُکتا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح سکون و اطمینان کی زندگی نصیب ہو بھیڑ کا افسوں چل گیا اور سب نے یک لخت صید افگنی سے توبہ کر لی اور دینی گوسفندی اختیار کر لیا نتیجہ کیا ہوا۔

از علف آں تیزیِ دنداں نماند ‌‌‌‌‌ ہیبتِ چشمِ شرار افشاں نماند

دل بتدریج از میاں سینہ رفت ‌‌‌‌‌ جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

آں جنونِ کوششِ کامل نماند ‌‌‌‌‌ آں تقاضائے عمل در دل نماند

اقتدار و عزم و استقلال رفت — اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنین بے زور شد — مردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی — کوتہ دستی بے دلی دون ہمتی
شیر بیدار از فسون میش خفت — انحطاط خویش را تہذیب گفت

اقبال نے تربیت خودی کے تین مرحلے قائم کیے ہیں۔ اور پہلے مرحلہ کا اطاعت دوسرے کا ضبط نفس اور تیسرے کا نیابت الٰہی نام رکھا ہے۔

مرحلہ اول اطاعت

یعنی فرائض کے ادا کرنے میں سستی و کاہلی نہ کرنا اور صبر و استقلال کے ساتھ سرگرم عمل رہنا

تو ہم از بار فرائض سر متاب — برخوری از عندہ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می‌شود از جبر پیدا اختیار

اس شعر میں الٰہیات اسلامیہ کے مشہور مسئلہ جبر و اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سچی حریت اطاعت یعنی پابندی فرائض سے پیدا ہوتی ہے۔

ناکس از فرمان پذیری کس شود — آتش ار باشد ز طغیان خس شود
ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند — خویش را زنجیری آئین کند
سبزہ بر دین نمو روئیدہ است — پایمال از ترک آں گردیدہ است

یعنی سبزہ دین نمو پر اگتا ہے اور جب اس دین (نمو) کو ترک کر دیتا ہے تو پامال ہو جاتا ہے۔ اقبال مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

باطن ہر شے ز آئینے قوی — تو چرا غافل ازیں ساماں شوی

یعنی دستور قدیم و آئین مذہب سے آزاد نہ ہو بلکہ اسی پابندی میں اپنی حریت و آزادی سمجھو

شکوہ سنج سختی آئیں مشو — از حدود مصطفیٰ بیروں مشو

مرحلہ دوم ضبط نفس۔ اس کے پانچ ارکان ہیں۔ کلمہ توحید۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ

یعنی نفس پر قابو رکھنا۔ اور یہہ کام اگرچہ نہایت مشکل ہے مگر انسان باوجود مشکلات و موانع کے مراتب معرفت طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں فرشتہ کی رسائی نہیں حتیٰ کہ تمام کائنات اس کے زیر فرمان ہو جاتی ہے اس لئے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ لیکن جو شخص نفس کا تابع ہو کر ہوا و ہوس میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ دین و دنیا میں ذلیل و خوار اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتا ہے۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است　　خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمام او بکف　　تا شوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش روان　　می شود فرمان پذیر از دیگران

اقبال کہتا ہے کہ تیری تعمیر آب و گل سے تیار ہوئی ہے اور محبت اور خوف کو تیری سرشت میں داخل کیا ہے یعنی ایک طرف تو دنیا و عقبیٰ کے خوف میں مبتلا ہے اور دوسری طرف مال و دولت اور فرزند و زن کی محبت میں پابند ہے۔ اور چونکہ آب و گل کا اقتضا تن پروری ہے اسلئے ہوائے نفسانی میں مبتلا ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن جب تک تیرے پاس لا الٰہ کا عصا موجود ہے اسوقت تک تو ہر قسم کے خوف و خطر سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے

تا عصائے لا الٰہ داری بدست　　ہر طلسم خوف را خواہی شکست

کیونکہ جو شخص توحید کا قائل ہو وہ باطل کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ اور دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ ہاں جس کو توحید پر یقین کامل نہو۔ وہ ماسوا اللہ کے آگے سر جھکاتا اور دنیا کی فرعونی طاقتوں سے ڈر جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص عشق الٰہی کی آگ اپنے دل میں رکھتا ہے اسکو کسی قسم کی محبت خدا سے غافل نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ راہ خدا میں اپنے لخت جگر کے حلق پر چھری پھیر دینا عین ثواب سمجھتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔

ہر کہ حق باشد چو جان اندر تنش　　خم نگردد پیش باطل گردنش

خوف را در سینهٔ او راہ نیست   خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد   فارغ از بند زن و اولاد شد
می کند از ما سوا قطع نظر   می نہد ساطور بر حلق پسر

کلمہ توحید کے بعد نماز کی تعریف کرتا ہے۔

لا الہ باشد صدف گوہر نماز   قلب مومن را حج اصغر نماز
در کف مسلم مثال خنجر است   قاتل فحشا و بغی و منکر است

یعنی اگر کلمہ توحید صدف ہے تو نماز گوہر کا مرتبہ رکھتی ہے نماز مسلمان کے پاس ایک تلوار ہے جو منکرات و محرمات کو قتل کرتی اور پاکی و روحانیت کی سیر کراتی ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ان الصلوٰۃ تنہیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی اسکے بعد رکن ثالث کی تعریف کی ہے۔

روزہ بر جوع و عطش شبخون زند   خیبر تن پروری را بشکند

یعنی روزہ بھوک اور پیاس کو زائل کرتا تن پروری سے روکتا اور تکلیف اور محنت برداشت کرنیکا عادی بناتا ہے۔ اس کے بعد رکن رابع کی تعریف کی ہے۔

مومناں را فطرت افروز است حج   ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایۂ جمعیتے   ربط اوراق کتاب ملتے

حج مسلمان کو وطن کی محبت قطع کرنے اور ہجرت کی تعلیم دیتی ہے۔ فطرت کو روشن ضمیر کو پاک دل کو قوی اور یقین کو محکم بناتی ہے۔ جمعیت کو قائم رکھنے والی اور کتاب ملت کے اوراق پریشان میں تنظیم و اتحاد پیدا کرنے والی ہے۔

رکن خامس زکوٰۃ ہے۔

حب دولت را فنا ساز زکوٰۃ   ہم مساوات آشنا ساز زکوٰۃ
دل ز حتی تنفقوا محکم کند   زر فزاید الفت زر کم کند

یعنی زکوٰۃ حب دولت کو مٹاتی ہے انسان کو مساوات آشنا بناتی ہے مال و دولت

میں اس سے برکت ہوتی ہے اور انسان کی طبیعت میں سیرچشمی پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر یقین کامل کیساتھ اسلام پر قائم ہے تو سبھی کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

مرحلۂ سوم نیابت الٰہی

اس میں یہ بتایا ہے کہ جب انسان اپنے نفس کو مطیع و منقاد کرکے ان ارکان خمسہ پر عامل ہوتا ہے تو نیابت الٰہی کا اہل ہوجاتا ہے ملک جاودانی کی حکومت اور دنیا کی شہنشاہی اسکو ملجاتی ہے۔ اور کوئی چیز اس کے احاطہ اثر سے باہر نہیں ہوتی۔ حقائق عالم سے واقف اور اسرار ممکنات سے باخبر ہوتا ہے۔

گر شتر بانی جہاں بانی کنی | زیب سر تاج سلیمانی کنی
تا جہاں باشد جہاں آرا شوی | تاجدار ملک لا یبلیٰ شوی

اس کے بعد نائب حق کی تعریف کی ہے۔ اور اس کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

نائب حق ہمچو جان عالم است | ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگہ بود | در جہاں قائم بامر اللہ بود
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را | از حرم بیروں کند اصنام را
نوع انسان را بشیر و ہم نذیر | ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر
مدعائے علم الاسما ستے | سر سبحان الذی اسریٰ ستے
از عصا دست سفیدش محکم است | قدرت کامل بعلمش توام است
خنک سازد ہیبت او نیل را | می برد از مصر اسرائیل را
از قم او خیزد اندر گور تن | مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

(۹) اقبال کا ایک موضوع بیخودی ہے۔ بیخودی کے معنی ہیں۔ اپنے آپ کو جماعت میں ملا دینا یعنی فرد کا اپنے احساسات کو جماعت کے مقصد وحید کے اندر فنا کردینا کیونکہ فرد کیلئے جماعت میں داخل ہونا آئینۂ رحمت اور اپنی ہستی کو جماعت سے علیحدہ سمجھنا علین کمال

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
حرز جان کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد میگیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

یعنی جس طرح قطرہ دریا میں ملکر دریا ہو جاتا ہے اسی طرح فرد جماعت میں داخل ہو کر جماعت کی قوت جماعت کا وقار اور جماعت کے اوصاف سے متصف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جماعت وہ ہے جو مختلف عناصر افراد سے اس طرح مرکب ہوئی ہو کہ اس کا کوئی جز اپنی اصلی حالت پر برقرار نہ رہا ہو اور اس کے ہر فرد سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں یا ہر فرد اس حالت میں جو کچھ سمجھتا بوجھتا ہے وہ اسکے خلاف ہوتا ہے جو حالت انفرادی میں سمجھتا بوجھتا تھا۔ بلکہ اس کا ظاہر و باطن اس کا قول و فعل اسکی نیت اور اس کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو قوم کا ہوتا ہے۔ یعنی فرد جماعت میں گذشتہ اور آئندہ حالات کا آئینہ ہے۔ گذشتہ کا اس لئے کہ جماعت کے اندر قدامت پرستی کا جذبہ حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی روایات قدیمہ کو نہایت سختی سے قائم رکھتی ہیں اگرچہ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعت نے اپنے رسوم و اعتقادات کو تبدیل کر دیا مگر در اصل یہ ظاہری تبدیلی ہوتی ہے اور حقیقت اسکی غیر متبدل ہوتی ہے اور آئندہ حالات کا اس لئے کہ جماعت کے موجودہ اخلاق و تنظیم قومی کو دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسکے افراد کا مستقبل کیا ہوگا

وصل استقبال و ماضی ذات او — چون ابد لا انتہا اوقات او
پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم — ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم
در زبان قوم گویا میشود — بر رہ اسلاف پویا میشود
مایہ دار سیرت دیرینہ او — رفتہ و آئندہ را آئینہ او

اسکے بعد اقبال نے خودی و بیخودی کا فرق بتایا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ جماعت

میں داخل ہو کر خودی اپنے اوصاف خصوصی کو بھول جاتی ہے اور جماعت کے اوصاف اختیار کر لیتی ہے۔ جب تک انفرادی حالت میں تھی دوئی سے پاک تھی اس لئے کہ من و تو محض اعتبارات ہیں ورنہ اسی کے پرتو اور اسی کے جلوے ہیں۔ لیکن جب حالت انفرادی سے اجتماعی حالت میں آتی ہے تو من کو چھوڑ کر اور تو ہو جاتی ہے جب تک انفرادی حالت میں تھی آزاد تھی یعنی اسکو اختیار تھا کہ جو چاہے کرے۔ لیکن جماعت میں داخل ہو کر پابند ہو جاتی ہے۔ اپنی رائے کو جماعت کی رائے میں اور اپنے مقاصد کو جماعت کے مقاصد میں فنا کر دیتی ہے۔ چونکہ یہ فرق ذرا باریک ہے اس لئے اقبال کہتا ہے کہ۔

نکتہ ہا چوں تیغ پولاد است تیز گر نمی فہمی ز پیشِ ما گریز

اسکے بعد یہ بتایا ہے کہ اختلاط ملت افراد سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے۔ یعنی افراد جماعت میں داخل ہو کر ایک دوسرے سے مانوس آپس میں معاون و مددگار اور رواداری و اخوت سے خوگر ہو جاتے ہیں مگر ابتدائے آفرینش میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ جماعت پر کیفیت نیم شعوری کا غلبہ رہتا ہے تہذیب و تمدن میں وحشت و بربریت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس کا کوئی کام سلیقہ اور عمدگی سے انجام نہیں پاتا تحقیق و تلاش کی دلدادہ نہ آرزو کی شیدائی بلکہ توہمات میں مبتلا اور افسانہائے دیو و پری کی سودائی۔ خیالات پست اور حوصلے کوتاہ ہوتے ہیں معمولی بات سے ڈرنا۔ خیالی معبودوں کی پرستش کرنا اور محنت سے گھبرانا اس کا خمیر مایہ ہوتا ہے۔ بحر کی روانی اور قدرت کی حسن آفرینیاں اس کو اپنی طرف مائل نہیں کرتیں یہاں تک کہ خلاق عالم ایک صاحب دل (پیغمبر) کو بھیجتا ہے جو دین و دنیا کی تعلیم دیتا اور امید و بیم کے جلوے دکھاتا ہے اعمال محمود و کردار ستودہ پر جنت کی بشارت اور اعمال ناسزا و حرکات ناشائستہ پر دوزخ سے ڈراتا ہے اسکے دم سے ملت میں زندگی اور اسکی تعلیم سے جماعت میں۔

جوشِ مردانگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

نقش پاشش خاک را بینا کند | ذرہ را چشمک زن سینا کند
عقل عریاں را دہد پیرایۂ | بخشد ایں بے مایہ را سرمایۂ
بند ہا از پا کشاید بندہ را | از خداوندان رباید بندہ را

یعنی نوع انسان کو غلامی سے آزاد کراتا اور توہم پرستی سے نجات دلاتا ہے معبودان مجازی سے جدا کرتا اور معبود حقیقی سے ملاتا ہے۔ جماعت کو ایک مقصد کیطرف بلاتا اور ایک خیال کیطرف دعوت دیتا ہے۔ کثرت موہوم کو مجازی و اعتباری بتاتا اور نکتہ توحید سکھاتا ہے۔

اسکے بعد بتایا ہے کہ ملت اسلامیہ کے ارکان اساسی توحید و رسالت ہیں یعنی اسلام میں سب سے مقدم توحید و رسالت پر ایمان لانا ہے۔ اور ناامیدی خوف اور رنج تمام برائیوں کی جڑ ہیں اور زندگی کو قطع کرنیوالے اور توحید ان امراض کا علاج ہے۔

مرگ را ساماں ز قطع آرزوست | زندگانی محکم از لاتقنطوا ست
ناامیدی ہمچو گور افشاردت | گرچہ الوندی ز پا می آوردت
از دمش میرد قوائے زندگی | خشک گردد چشمہائے زندگی
اے کہ در زندان غم باشی اسیر | از نبی تعلیم لاتحزن بگیر
گر خدا داری زغم آزاد شو | از خیال بیش و کم آزاد شو

منشا یہ ہے کہ آرزو کا قطع کرنا زندگی سے ہاتھ دھونے کے مرادف ہے اور مسلمان وہ ہے جو کسی حال میں ناامید نہ ہو بلکہ ہر وقت خدا کے فضل و کرم کا امیدوار ہو۔ ناامیدی مسلمانوں کا قومی شیوہ ہے نام بھی لیتے نہیں ہرگز مسلمان یاس کا۔ ناامیدی انسان کو پست ہمت بزدل اور ناشکرا بناتی ہے اور امید تمناؤں کی خشک کھیتی کو رحمت الٰہی کے تصور سے سرسبز و شاداب رکھتی ہے۔ ناامیدی ترقی سے تنزل اور آسمان اقبال سے خاک ادبار پر لا ڈالتی ہے اور امید فرش خاک سے اٹھا کر افلاک پر پہنچاتی ہے۔ غرضکہ جو شخص خدا و رسول پر ایمان رکھتا اور توحید و رسالت

کا دل سے قائل ہو وہ کیسے ہی موقع پیش آئیں کبھی جی نہیں چھوڑتا۔ اور آخر میں کامیاب ہوتا اور دین و دنیا میں سرخروئی حاصل کرتا ہے۔ اقبال نے اس موقعہ پر ایک نہایت برمحل واقعہ لکھا ہے ایکروز حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ صبح کیوقت اپنے ایک خادم کیساتھ سیر و تفریح کیلئے شہر سے باہر نکلے۔ صبح کا سہانا وقت نسیم سحری کے نرم و نازک جھونکے۔ ترو تازہ پھولوں کی مہک۔ روح میں اہتزاز اور دل میں بالیدگی پیدا کر رہی تھی۔ طائران خوش الحان کی نغمہ سنجی مناظر قدرت کی بوقلمونی جنت نگاہ و فردوس گوش کے سامان بہم پہنچا رہی تھی۔ ایسے مبارک وقت میں عالمگیر جیسا انسان خدا کی یاد سے کیونکر غافل رہ سکتا تھا۔

شاہ رمز آگاہ شد محو نماز خیمہ برزد درحقیقت از نماز

لیکن نماز میں کھڑا ہوتا تھا کہ جنگل سے ایک شیر ببر جسکی آواز سے زمین لرزتی تھی دہاڑتا ہوا اور اس شہنشاہ حق آگاہ پر حملہ کیا۔ چاہتا تھا کہ اپنے پنجۂ خار اشگاف کی قوت کا مظاہرہ کرے کہ اس مرد خدا نے اپنا خنجر خون آشام میاں سے نکالا اور بغیر دیکھے ہوئے ایک ہی وار میں اس شیر کو فرش خاک پر لٹا دیا۔ اور پھر نماز میں محو ہوگیا اسکے بعد اقبال کہتا ہے کہ مسلمان کے سینہ میں ایسا بیباک دل ہونا چاہیئے۔

ایں چنیں دل خود نما و خود شکن دارد اندر سینہ مومن وطن
بندۂ حق پیش مولا لاستے پیش باطل از نعم برجاستے
تو ہم اے ناداں دلے آور بدست شاہدے را محملے آور بدست
عشق را آتش زن اندیشہ کن روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
خوف حق عنوان ایمان است و بس خوف غیر از شرک پنہان است و بس

یعنی جسطرح خدا سے ڈرنا ایمان کی نشانی ہے اسیطرح ماسوا اللہ سے ڈرنا شرک خفی سے کم نہیں۔ اسکے بعد بتایا ہے کہ توحید مسلمان کا ایمان ہے اور رسالت اسکی روح رواں اگر محض توحید کا قائل ہو اور رسالت پر ایمان نہیں رکھتا تو بمنزلہ اس پھول کے ہے جسمیں رنگ ہے مگر بو نہیں۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید　　وز رسالت در تن ما جان دمید

حرف بے صوت اندریں عالم بدیم　　از رسالت مصرع موزوں شدیم

از رسالت در جہاں تکوین ما　　از رسالت دین ما آئین ما

رسالت سے اتحاد و اخوت افراد مختلفہ میں وحدت اور مقاصد میں یگانگی پیدا ہوتی ہے

از رسالت صد ہزار ما یک است　　جزو ما از جزو ما لاینفک است

کثرت ہم مدعا وحدت شود　　پختہ چوں وحدت شود ملت شود

زندہ ہر کثرت ز بند وحدت است　　وحدت مسلم ز دین فطرت است

دین فطرت از نبی آموختیم　　در رہ حق مشعلے افروختیم

تا نہ ایں وحدت ز دست ما رود　　ہستی ما با ابد ہمدم شود

اسکے بعد یہ بتایا ہے کہ رسالت محمدیہ کا مقصد حریت مساوات اور بنی نوع انسان میں اخوت قائم کرنا ہے یعنی اسلام سے پہلے دنیا میں جہالت کی ایسی تاریکی پھیلی ہوئی تھی کہ انسان اسقدر زبوں حال تھا کہ کہیں سطوت کسرےٰ و صولت قیصر کا پرستار تھا کہیں کاہن و پاپا کا بندۂ حق گذار۔ کہیں بادشاہ و امیر اسکے آقا تھے کہیں پادری اور پجاری خداوند تھا کہیں وہ برہمن گل از خیابانش بہ بر ؎ خرمنش مغ زادہ با آتش بہ بر۔ فی الجملہ اس ایک شکار (انسان) کیلئے سیکڑوں جال بچھے ہوئے تھے اور اس ایک گردن میں ہزاروں پھندے پڑے ہوئے تھے۔

از غلامی فطرت او دوں شدہ　　نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہانتک کہ ایک امین حق سراپا رحمت بنکر آتا ہے حق کو وارثان حق کے سپرد کرتا ہے۔ نمرودوں اور فرعونوں کی سرکشی کا خاتمہ کرتا ہے اور غلاموں کو مسند خاقان پر بٹھاتا ہے۔ اسی فطرت انسانی میں جو زنگ غلامی سے مردہ ہو چکی تھی عالم افروز جلوے اور اسی خاکستر سے جو باطل پرستی کے سبب سرد ہو چکی تھی فطرت انسانی کو روشنی کر دکھلائی مگر کفر سوز

چنگاریاں پیدا کرتا ہے۔

شعلۂ از مردہ خاکستر کشاد | کوہکن را پایۂ پرویز داد
تازہ جاں اندر تنِ عالم دمید | بندہ را باز از خداوندان خرید

اسکے پیدا ہوتے ہی حریت و آزادی اخوت و رواداری عالمِ وجود میں آئی ہے اور کفر و الحاد شرک و طغیان مارے حیبت کے خودکشی کرنا شروع کرتے ہیں۔

حریت زاد از ضمیرِ پاکِ او | ایں مئے نوشین چکید از تاکِ او
نقشِ نو بر صفحۂ ہستی کشید | امتے گیتی کشائے آفرید
امتے از ماسوا بیگانۂ | بر چراغ مصطفےؐ پروانۂ
کل مومن اخوۃ اندر دلش | حریت سرمایۂ آبِ گلش

یعنی کل مومن اخوۃ کا سبق پڑھا کر حریت کا سرمایہ دار بنا دیا۔ اور امتیازات رنگ و بو کو مٹا کر سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ افغانی تورانی۔ ترکی و تاتاری کو ایک مسلمان کے لقب سے ملقب کر کے پابندی ملک و نسب سے آزاد کر دیا۔ جیسا کہ حضرت سلمان فارسی سے لوگوں نے ان کا شجرہ نسب دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا سلمان ابن اسلام۔ اقبال نے سلطان مراد اور معمار کا واقعہ نقل کر کے مساوات اسلامیہ کو ثابت کیا ہے۔

خجند کی ولایت میں ایک معمار تھا۔ جو فن تعمیر میں کمال رکھتا تھا۔ اس نے بادشاہ کے حکم سے ایک مسجد تیار کی مگر بادشاہ کو ناپسند آئی اور ناراض ہو کر اسکے ہاتھ قلم کرا دئے وہ معمار اپنے خون سے زمین کو لالہ زار بناتا ہوا قاضی وقت کے پاس پہنچا۔ اور بادشاہ کے ظلم سے انصاف چاہا۔

گفت اے پیغامِ حق گفتارِ تو | حفظِ آئینِ محمدؐ کارِ تو
سفتہ گوشِ سطوتِ شاہاں نیم | قطع کن از روئے قرآں دعویم

یہ داستانِ ستم سنکر قاضی کو مارے غصہ کے تاب نہ رہی اور فوراً بادشاہ کو اپنے حضور

میں طلب کیا بادشاہ نے جبوقت قرآن کا نام سُنا خوف سے کانپنے لگا اور خطا کار کی طرح قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا۔

رنگ شہ از ہیبت قرآن پرید ‌ ‌ پیش قاضی چوں خطا کاراں رسید

از خجالت دیدہ بر پا دوختہ ‌ ‌ عارض او لالہ ہا اندوختہ

یعنی شرم و ندامت سے سر جھکائے ہوئے آکر اس معمار کے برابر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ اے مسند شرع کے وارث! میں اپنے کئے پر شرمندہ ہوں اور اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔

گفت قاضی فی القصاص آمد حیات ‌ ‌ زندگی گیرد بایں قانون ثبات

قاضی نے کہا کہ قرآن شریف میں آیا ہے ولکم فی القصاص حیاۃ یااولی الالباب۔ اور

عبد مسلم کمتر از احرار نیست ‌ ‌ خون شہ رنگین تر از معمار نیست

جبوقت مراد نے یہ آیہ محکم سنی تو اپنا ہاتھ آستین سے باہر کر دیا اور کہا کہ بھلا حکم قرآن سے کس کو مفر ہے؟

چوں مُراد ایں آیۂ محکم شنید ‌ ‌ دست خویش از آستین بیروں کشید

لیکن مدعی نے جب یہ حال دیکھا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا اور فوراً آیہ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان الخ پڑھنے لگا۔ اور کہا کہ اے حاکم شرع! میں نے اس کو خدا و رسول کے لئے معاف کیا۔

یافت مورے بر سلیمانی ظفر ‌ ‌ سطوت آئین پیغمبر نگر

پیش قرآن بندہ و مولا یکے است ‌ ‌ بوریا و مسند دیبا یکے است

اسرار خودی و رموز بیخودی کے بعد پیام مشرق ہے جو گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ کہیں کہیں جرمن شاعر ہائین اور گوئٹے کا جواب ہے اور شروع میں رباعیات ہیں جو بابا طاہر عریان کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً آرٹ اور نیچر کی

بحث کے متعلق یہ رباعی ہے

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت — فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نرنجی با تو گویم — صنم از آدمی پائندہ تر بود

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور — کہ جانِ تو ز خود نا محرمے ہست
قدم اندر تلاشِ آدمے زن — خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اس کتاب میں یورپین مسائل کے متعلق ہی نظمیں ہیں مثلاً جس زمانہ میں سمندروں کی آزادی پر بحث ہو رہی تھی اقبال نے اس مسئلہ کے متعلق لکھا تھا

بطے می گفت بحر آزاد گردید — چنیں فرمان ز دیوانِ خضر رفت
نہنگے گفت رو ہر جا کہ خواہی — ولے از ما نباید بے خبر رفت

اقبال کی چوتھی تصنیف زبورِ عجم ہے اس کے تین حصے ہیں اول غزلیات دوم گلشنِ راز سوم بندگی نامہ حصہ اول پھر تین حصوں میں منقسم ہے اول خدا دوم انسان۔ سوم بزمِ قدرت۔ گلشنِ راز۔ ایران کے مشہور صوفی اور فلاسفر علامہ محمود شبستریؒ کی مثنوی ہے۔ خراسان کے باشندوں نے علامہ موصوف سے تیرہ سوال کئے تھے جن کا جواب ترتیب وار انہوں نے گلشنِ راز میں دیا ہے۔ اقبال نے ان میں سے نو سوال لئے ہیں اور موجودہ زمانہ کے مقتضیات و احوال کو مدِ نظر رکھ کر ان کا جواب دیا ہے اس ضمن میں یورپ کی جمہوریت اور مذہب و سیاسیات کی علیحدگی اور اسی قسم کے بہت سے اہم مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں مثلاً جمہوریت کے متعلق لکھا ہے۔

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است — رسن از گردنِ دیوے کشاد است
گروہے را گروہے در کمین است — خدایش یار گر کارش چنین است

مذہب و سیاسیات کی علیحدگی کے متعلق لکھا ہے۔

خرد را با دل خود ہم سفر کن — یکے بر ملتِ ترکان نظر کن

به تقلید فرنگ از خود رمیدند | میانِ ملک و دین ربطے ندیدند
به کف رہبروں جہانِ چارسو را | مقامِ نور و صوت و رنگ و بو را
فزونش کم کم او بیش کردن | دگرگوں با مراد خویش کردن
به رنج و راحت او دل نہ بستن | طلسمِ نہ سپہر او شکستن
فرو رفتن چو پیکاں در ضمیرش | نہادن گندم خود با شعیرش
شکوہ خسروی این است این است | ہمیں ملک است کو توام بہ دین است

اقبال کی جدید تصنیف جاوید نامہ ہے۔ یہ حقیقت میں ایشیا کی ڈیوائن کامیڈی ہے جیسے ڈانٹے کی تصنیف یورپ کی ڈیوائن کامیڈی ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ شاعر مختلف سیاروں کی سیر کرتا ہے اور اس میں مختلف مشاہیر کی روحوں سے ملکر باتیں کرتا ہے پھر جنت میں جاتا ہے اور آخر میں خدا کے سامنے پہنچتا ہے۔ اس تصنیف میں دورِ حاضر کے تمام جماعتی اقتصادی سیاسی مذہبی اخلاقی اور اصلاحی مسائل زیر بحث آگئے ہیں اس میں صرف دو شخصیتیں یورپ کی آئی ہیں اول کچنر دوم نٹشا باقی تمام شخصیتیں ایشیا کی ہیں۔ ڈانٹے نے اپنا رفیق سفر یا خضر طریق ورجل کو بنایا تھا اقبال کا رفیق سفر یا خضر طریق مولانا روم ہیں مثلاً چاند میں ہندوستان کے مشہور ہندو صوفی و شعرا متر سے ملاقات ہوتی ہے جس کا نام جاوید نامہ میں جہاں دوست رکھا ہے اسلئے کہ وشوامتر کے معنی جہاں دوست کے ہیں۔ وشوامتر سے جو باتیں ہوئیں۔

گفت مرگ عقل؟ گفتم ترک فکر | گفت مرگ قلب؟ گفتم ترک ذکر
گفت دین عامیاں؟ گفتم شنید | گفت دین عارفاں؟ گفتم کہ دید
گفت آدم؟ گفتم از اسرار اوست | گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست
گفت این علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست | گفت حجت چیست؟ گفتم روئے دوست

زبور عجم اور جاوید نامہ میرے پاس موجود نہیں اسلئے تنگی وقت۔ اور تقاضائے بیم کے

سبب سے ان دونوں کتابوں کے متعلق میں نے اقبال کے ذاتی خیالات کو جو اس نے لندن میں انڈیا سوسائٹی کے کسی جلسہ میں ظاہر کئے تھے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے غرضکہ اقبال نے جو کچھ لکھا ہے اسپر بالاستیعاب تبصرہ کرنا مشکل نہ سہی لیکن اس مختصر رسالہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا رسالہ کی اصل غرض و غایت کے منافی متصور ہے - میں یہہ چاہتا ہوں کہ کم از کم اقبال کی طرف سے لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے اور وہ یہہ سمجھ لیں کہ اقبال شعرائے لکھنو کی طرح حسن لب بام کا شیدائی یا کمر یار کی تحقیق کا سودائی نہیں بلکہ وہ ایسی ہستی ہے کہ اسکے علو مرتبہ اور کمال ذاتی ہی نے ابتک اسکی حقیقت کو پردہ میں رکھا اسلئے کہ جو دل و دماغ وہ لیکر آیا ہے اور جس تمدن جس خلاق اور جس تہذیب کی وہ ترجمانی کرتا ہے - اسکے چاہنے والے دنیا سے اٹھ گئے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے -

اب تو ویراں ہو گیا گلشن ہوا برہم ترا	بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

اس لئے ایجاز و اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے دو ایک اعتراضات کا جو اقبال پر کئے جاتے ہیں جواب دیکر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں -

پہلا اعتراض یہہ ہے کہ اقبال نے فارسی زبان کو اپنے لئے انتخاب کرنے میں انتہائی غلطی کی ہے - عرض ہے کہ اقبال کا کلام ایک پیغام امن ہے جسکو دوسرے معنوں میں تعلیم اسلام کہہ سکتے ہیں اور یہہ پیغام وہ تمام دنیا کو پہنچانا چاہتا ہے - اسکے لئے اسکے پاس دو زبانیں تھیں اردو اور فارسی - اردو ہندوستان کی زبان ہے اور ہندوستان سے باہر کہیں نہیں بولی جاتی اور چونکہ ابتک اس قسم کے خیالات کو اسمیں جگہ نہیں دیگئی اسلئے علمی حیثیت سے کم مایہ بھی ہے جیسا کہ اقبال کا خیال ہے

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے	شمع یہہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے

برخلاف اسکے فارسی زبان اول تو ہندوستان میں جہاں جہاں اردو ہے وہاں فارسی

کی تعلیم بھی کم و بیش جاری ہے بلکہ تعلیم کے اعتبار سے نسبتاً فارسی کو اردو سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اگر ہندوستان بالکل ہی فارسی سے بے بہرہ ہوتا تب بھی اس کو شکایت کا موقع نہیں تھا اس لئے کہ اقبال کے کلام کا ایک کافی و وافی حصہ اردو میں موجود ہے اور وہی باتیں جو اس نے فارسی میں تفصیل کیساتھ بیان کی ہیں اردو میں اجمالاً مل سکتی ہیں۔

رہا بیرون ہند کا معاملہ: اہل فارس کی تو زبان ہی فارسی ہے اور سب سے زیادہ اسکو ضرورت ہے اسلئے کہ زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنیوالی کیفیت اور عشرت و کامرانی سے لذت اندوز ہونیکی حالت بہ نسبت دیگر اقوام کے ان پر زیادہ غالب ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ "اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اسکی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اسکا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو جائے" اسلئے اقبال کے کلام کی اہل فارس کو بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کو فارسی میں پورا کیا جا سکتا تھا نہ کہ اردو میں یا کسی اور زبان میں۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ آزادی اور غلامی میں زمین و آسمان کا فرق ہے وہ اقوام جنکی گردنوں میں غلامی کے طوق پڑے ہوئے ہیں۔ اسی حد تک کسی بات پر عمل کر سکتی ہیں جس حد تک انکی غلامانہ ذہنیت اور حد اختیار اجازت دے اور آزاد اقوام ہر نیک پیغام پر لبیک کہہ سکتی ہیں اور خود عامل ہو کر دوسروں کو بھی قید سلاسل سے نجات دلا سکتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اہل فارس میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اگر اقبال کے کلام کی وہاں اشاعت کیگئی تو کچھ بعید نہیں کہ ہندوستان کو بھی وہ چیز نصیب ہو جائے جس کے وہ ایک مدت سے خواب دیکھ رہا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا روم سنائی سعدی فردوسی اور عمر خیام جیسی ہستیوں نے

احکام الٰہی اور مذہب و شریعت کے اصول اور نکات علوم کو عربی سے لیکر فارسی میں اس خوبصورتی سے پیش کیا کہ دُنیا کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں - اور اکبارگی فارسی کی قدر عالمگیر ہوگئی - اور کیا عرب کیا عجم یورپ میں فارسی کو وہ مرتبہ حاصل ہو کہ آج بڑے بڑے مشاہیر اساتذہ کے کلام کو انگریزی فرانسیسی اور جرمنی زبانوں میں کثرت سے ترجمہ کیا جارہا ہے - کیا یہ مرتبہ اردو یا کسی دوسری زبان کو حاصل ہو سکتا تھا - اور خود اقبال کو رموز خودی اور اسرار بیخودی لکھنے کے بعد اسکا تجربہ ہو چکا تھا

آسانی اور بلاغت کے اعتبار سے دیکھئے تو جو کام فارسی کا ایک لفظ کرجاتا ہے وہ اُردو کے ایک پورے فقرہ سے نہیں ہوسکتا - اور جو مفہوم فارسی کے ایک فقرہ سے ادا ہوتا ہے اُردو کا ایک شعر اسکے ادا کرنے میں قاصر ہے - اسکے علاوہ فقرونکا ڈھلاؤ الفاظ کی نشست تراکیب کی چستی زور کلام اور خوبصورتی و دلآویزی جو فارسی میں ہے وہ دوسری زبان کو نصیب نہیں اور اس کا تجربہ اقبال کو اس وسیع مطالعہ کے بعد ہوا جو اس نے فارسی تصانیف کا انتہائی دقت نظر اور استیعاب کیا تھہ کیا تھا - اور جس کو اس نے ایک کتاب کی شکل میں ظاہر کیا جس کو فلسفہ ایران کی مختصر تاریخ کہہ سکتے ہیں اور جس پر اسے جرمنی سے ڈاکٹر کا علمی درجہ ملا - اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال نے فارسی زبان کے انتخاب میں کس حد تک دوراندیشی سے کام لیا ہے -

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال کا پالٹکس سے قطع نظر واقف ہوتے ہوئے سیاسی معاملات میں شریک ہونا اسکے لئے بھی اور قوم کیلئے بھی مضر ثابت ہوگا - غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے ایسی کتاب عطا کی ہے جس میں دینی و دنیوی دونوں زندگیوں کے ہر پہلو کو بطریق احسن بیان کیا ہے - اس کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں رہتی - جیسا کہ اقبال کہتا ہے -

ملتے را رفت چوں آئین ز دست — مثل خاک اجزائے او از ہم شکست
ہستی مسلم ز آئین است و بس — باطن دین نبی این است و بس
تو ہمے دانی کہ آئین تو چیست — زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟
آن کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

لیکن اسکو سمجھنے کے لئے قابلیت درکار ہے۔ اقبال ایک مسلمان اور خالص مسلمان ہے اور قرآن پر اس کا کامل ایمان ہے وہ جانتا ہے کہ کوئی پالیٹکس اس جامع و مانع کتاب سے باہر نہیں ہو سکتا اگر نگاہ حقیقت بین ہو تو اس کے ایک ایک حرف میں دنیا کی حکمت اور دانشوری کے ہزاروں باب دیکھ سکتی ہے اور یوں دیکھئے تو آج جسقدر مشاہیر اہل الرائے نظر آتے ان میں کوئی بی۔اے ہے اور کوئی بیرسٹر کوئی ایم۔اے ہے اور کوئی ڈاکٹر مگر اقبال بیرسٹر بھی ہے اور ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی بھی ڈاکٹر بھی ہے اور سر بھی شاعر بھی ہے اور حکیم بھی علامہ بھی ہے اور صوفی بھی رفارمر بھی ہے اور فلسفی بھی نجوم بھی جانتا ہے اور سنسکرت بھی اگر ایک طرف اقتصادیات و معاشیات کا زبردست ماہر ہے تو دوسری طرف علم نفسیات کا زبردست استاد۔ اگر قدیم فلسفہ میں کمال رکھتا ہے تو فلسفہ جدید میں بھی اس کو ید طولے حاصل ہے۔ تاریخ اسلام ہی کا حافظ نہیں تاریخ عالم بھی اس کو ازبر ہے

جس کے فلسفہ دانی کو دیکھتے ہوئے جرمنی والوں نے ڈاکٹر کا علمی درجہ دیا اور جسکی ادبی کاوش کی قدر کرتے ہوئے سرکار انگریزی نے سر کا ممتاز خطاب عطا فرمایا۔ جس کی شاعری کا یہ حال کہ داغ نے دو ایک غزل دیکھکر ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا شاگرد کوئی معمولی شعر گو نہیں جس کی طبیعت داری

قابلیت اور دردِ اسلام کو دیکھ کر شبلی اور حالی جیسے مبصر تاڑ گئے تھے کہ یہ ایک فتنہ ہے اور بہت جلد قیامت بنجائے گا - اور جس کے شہرت سے اٹھتے ہوئے شباب کو دیکھ کر مسٹر آرنلڈ جیسے اُستاد کو فخر تھا کہ اقبال دنیا میں بڑا اقبال لیکر آیا ہے اس کے نام کے ساتھ میرا نام بھی روشن ہوگا - غرضیکہ مشاہیر وقت میں ہر ایک نے اس جوہر قابل کی شخصیت کا جداگانہ حیثیت میں اپنی فہم قابلیت اور رسائی فہم کے مطابق اعتراف کیا ہے - رہے کم استعداد اور کج فہم لوگ ان کے لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست -

جب اقبال ایسا ہے اور فی الواقعہ ایسا ہی ہے تو انصاف فرمائیے اگر وہ اس طرف مائل ہو تو کیا سیاسیات کے اسٹیج پر اس سے بہتر کوئی دوسرا شخص پارٹ کر سکتا ہے -

لیکن چونکہ اختلاف رائے ہمیشہ اعلیٰ و افضل شخصیتوں کا جزو لاینفک رہا ہے اس لئے ہم کو اس قسم کی تضاد رائے سے افسوس نہیں بلکہ ہمارے خیال میں نہایت تقویت اور استحکام پیدا ہوتا اور اقبال کے بلند مرتبہ شخصیت ہونے کا ثبوت ملتا ہے -

میرا یقین ہے کہ اقبال کی شہرت کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے اور عنقریب سمت الراس پر پہنچ کر ان شکوک و شبہات کی تاریکیوں کو دور کر کے دنیا کو اپنی روشنی سے جگمگا دیگا اور لوگوں کو اذا جاء الحق و زہق الباطل ان الباطل کان زہوقا کا منظر آنکھوں سے دیکھنے میں آجائے گا -

آخر میں ہونہار نوجوانوں سے توقع ہے کہ وہ زمانہ کی ناہمواریوں کو دیکھتے ہوئے میری اس مختصر تالیف کو نہیں بلکہ "علامہ اقبال" کو اپنے لئے شمع ہدایت بنائینگے

اس لئے کہ اس تلاطم اور کشمکش کے زمانہ میں اس سے بہتر کوئی رہنما نہیں مل سکتا۔ اور اہل قلم حضرات سے التماس ہے کہ وہ اغماض و چشم پوشی کو جو شایان شان بزرگی ہے کار فرمائیں گے اس لئے کہ یہ ناچیز تالیف اظہار قابلیت اور نمائش تبحر نہیں ہے بلکہ اس جوشش عقیدت کی ادنیٰ سی جھلک ہے جو ایک مدت سے میرے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا اور آخر ضبط سے باہر ہو کر زبانِ قلم سے تراوش کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وباللہ التوفیق والمستعان

مہجوران۔ سید محمد عبدالرشید فاضل

اس لئے کہ اس نازک اور کشمکش کے زمانہ میں اس سے بہتر کوئی رہنما نہیں مل سکتا۔ اور اہل قلم حضرات سے التماس ہے کہ وہ اغماض و چشم پوشی کو جو شایان شان بزرگی ہے کار فرمائیں گے اس لئے کہ یہ ناچیز تالیف اظہار قابلیت اور نمائش تبحّر نہیں ہے بلکہ اس جوشش عقیدت کی ادنیٰ سی جھلک ہے جو ایک مدت سے میرے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا اور آخر ضبط سے باہر ہو کر زبانِ قلم سے تراوش کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وباللہ التوفیق والمستعان

ہیچمدان سید محمد عبد الرشید فاضل